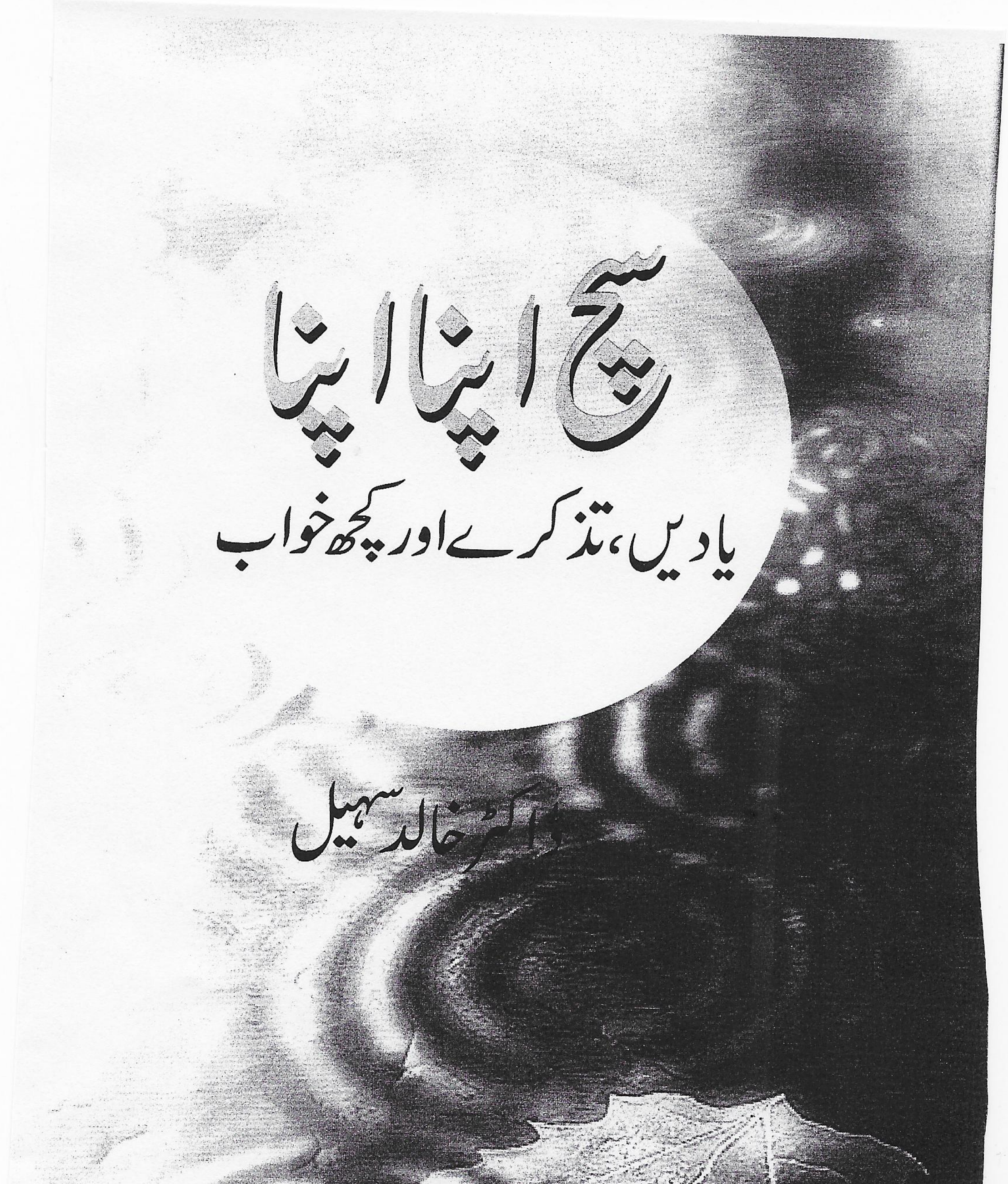
سچ اپنا اپنا
یادیں، تذکرے اور کچھ خواب
ڈاکٹر خالد سہیل

# جوگندر پال سے ملاقات

خالد سہیل

ہندوستان کے سفر کے دوران دہلی میں میں اپنے بزرگ دوست شارب ردولوی کے ہاں ٹھہرا جو اردو زبان و ادب کے اہم نقاد اور پروفیسر ہیں۔ شارب ردولوی نے بتایا کہ انہوں نے اپنے بہت سے دوستوں کو اس شام اپنے گھر بلایا ہے تا کہ میں ان سب سے مل سکوں۔ مہمانوں کی فہرست میں ارتضیٰ کریم اور قمر رئیس کے ساتھ جوگندر پال بھی شامل تھے۔ جوگندر پال کا نام سن کر میں چونکا کیونکہ میری نگاہ میں وہ اردو افسانے کا ایک اہم نام تھے۔

'ہم نے انہیں بلایا تو ہے' شارب کہنے لگے 'لیکن وہ یہاں سے چالیس کلومیٹر دور رہتے ہیں اور وہ گاڑی بھی نہیں چلاتے'۔

'کاش وہ آسکتے' میرے دل نے سرگوشی کی۔

اس شام بہت سے مہمان آئے اور ان سے بہت سی باتیں ہوئیں لیکن مجھے بار بار جوگندر پال کا خیال آرہا تھا۔ میں نے شارب صاحب سے پوچھا 'آپ مجھے کچھ جوگندر پال کے بارے میں بتائیں؟'

'میں ایک دفعہ ان سے ملنے گیا' شارب کہنے لگے 'میری خواہش تھی کہ وہ ایک انگریزی ناول کا اردو میں ترجمہ کریں۔ میں نے ان سے اس کتاب کا ذکر کیا تو انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا 'میں اپنی نوکری سے استعفیٰ دے رہا ہوں'۔

'وہ کیوں؟' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

'میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں ... نابیناؤں کے بارے میں ناول اور اس ناول کے لئے مجھے یکسوئی چاہئے اور یہ تخلیقی کام ملازمت کے دوران نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میں نوکری سے استعفیٰ دے کر دن رات اس ناول پر کام کرنا چاہتا ہوں' اور بعد میں پتہ چلا کہ اس

محنت کا نتیجہ ایک زبردست ناول تھا جس میں جوگندر پال نے ایک ایسے گھر کی کہانی سنائی ہے جس میں سب نابینا ہیں۔ نابیناؤں کی دنیا میں محبت اور پیار کے جذبوں کے اظہار اور پھر رشک وحسد کے جذبات کے بیان نے اس ناول کو معرکتہ الآرا بنا دیا ہے۔ میں تو جوگندر پال سے پہلے ہی متاثر تھا شارب ردولوی کی باتیں سن کر اور بھی متاثر ہو گیا۔ ابھی ہم ان کی باتیں ہی کر رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک سفید بالوں والے دراز قد بزرگ، شلوار، قمیص اور نیلا سویٹر پہنے داخل ہوئے اور سیدھا میرے پاس آ کر کہنے لگے 'کیا تم ہی خالد سہیل ہو؟'

'جی ہاں' میں نے مختصر سا جواب دیا

'میں جوگندر پال ہوں' اور مجھے بڑی شفقت اور محبت سے گلے سے لگا لیا۔ 'آؤ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھو' میں خاص تم سے ملنے اور کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔'

مجھے یوں لگا جیسے میں نے محبت کے سمندر کو چھو لیا ہو۔ ان کے انداز میں اتنی اپنائیت تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے میں جوگندر پال کو اور وہ مجھے صدیوں سے جانتے ہوں۔

ہمارے چاروں طرف لوگ تھے لیکن وہ مجھ سے ایسے باتیں کرتے رہے جیسے وہاں اور کوئی نہ ہو۔ کہنے لگے 'میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے تمہارا ناول 'ٹوٹا ہوا آدمی' پڑھا ہے۔ میں تمہاری جرأت کی داد دیتا ہوں۔ تم الفاظ اپنی ذات کے اظہار کے لئے استعمال کرتے ہو آجکل بہت سے ادیب انہیں اپنی ذات کو چھپانے کے لئے کرتے ہیں۔ میں تمہیں مبارکباد دینے آیا ہوں۔'

مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ ایک بزرگ ادیب کا ایک نوجوان ادیب کے لئے یہ مشفقانہ انداز اور یہ حوصلہ افزائی۔

'ادب تخلیق کرنے کے لئے جس شوق، جس جذبے، جس لگن اور جس قربانی کی ضرورت ہے وہ تمہارے دل میں موجود ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ لیکن میں تمہیں ایک نصیحت کرنے بھی آیا ہوں۔ میں نے اس راہ میں عمر گزار دی ہے۔ لکھاری بننا ایک فن ہے۔ اس فن کو سیکھنے میں عمر بیت جاتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اگلے پچاس سال اس کے اسرار و رموز سیکھنے میں گزار دو۔ میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاتا ہوں۔ تم ایک افسانہ نگار بھی ہو اور ایک ماہرِ نفسیات ہو۔ تمہارا ماہرِ نفسیات ہونا تمہارے لکھاری ہونے کے لئے فائدہ مند بھی ہو سکتا ہے اور نقصان دہ بھی۔ نقصان دہ اس وقت ہو گا جب تم کہانیوں میں کرداروں کی نفسیات

سمجھانا شروع کر دو گے۔ کہانی میں کچھ پر اسراریت رہنی چاہئے جسے قاری خود حل کرے۔ سب کچھ واضح کر دینا نفسیات کے مضمون میں تو اچھا ہو سکتا ہے افسانے میں نہیں۔ لکھنے کے فن میں مہارت حاصل کرنا آسان نہیں۔ لیکن تم ابھی نوجوان ہو۔ تم میں بہت سے امکانات ہیں۔ تم لکھتے ہو، تم پڑھتے ہو، تم سفر کرتے ہو، دنیا دیکھتے ہو، غور و خوض کرتے ہو۔ یہ سب باتیں تمہیں ایک اول درجے کا لکھاری بنائیں گی۔ میں بہت پرامید ہوں۔ میں یہی باتیں تمہیں بتانے آیا ہوں۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں یہاں نہیں ہوں گا لیکن تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی'۔

پھر جوگندر پال نے اپنا تازہ افسانوں کا مجموعہ 'کھلا' مجھے تحفتاً پیش کیا۔ 'یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں'۔ انہوں نے آٹوگراف کر کے مجھے کتاب دی۔ مجھے یوں لگا جیسے نہ جانتے ہوئے بھی وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں۔

کھانا کھانے کے بعد ارتضٰی کریم نے جوگندر پال سے پوچھا کہ کیا وہ میری کتاب کی تقریبِ رونمائی کی صدارت کرنے کی دعوت قبول فرمائیں گے۔ 'ضرور۔ میں ضرور اس تقریب میں شامل ہوں گا'۔

میں کافی دیر تک خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر میں نے پوچھا 'آپ کے لئے کہانی لکھنے کا تخلیقی عمل کیسا ہے؟'

'میرے لئے کہانی لکھنا دھند میں گاڑی چلانے کی طرح ہے۔ قاری میرا مسافر میرے ساتھ چل رہا ہوتا ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں مجھ پر نئے راستے اور نئے موڑ منکشف ہوتے ہیں اور قاری پر بھی۔ کہانی لکھنا اور پڑھنا دھیرے دھیرے انکشاف کا عمل ہے۔ میں ان لکھاریوں کو پسند نہیں کرتا جن کا کہانی کے شروع میں ہی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کن راستوں سے گزر کر کس منزل تک پہنچیں گے'۔

پھر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے۔ کچھ سوچتے رہے جیسے دھند میں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں اور کہنے لگے 'ایک جینون لکھاری genuine writer ہر نئے تجربے کے لئے تیار ہوتا ہے اور پھر نئے تجربے کو نئے انداز میں پیش کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ نئے تجربات ہمیں نئے انداز سے لکھنے پر مجبور کرتے ہیں ورنہ ہم خود اپنے کلیشے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انتظار حسین جیسا بڑا افسانہ نگار، جس کا میں بہت احترام کرتا ہوں وہ بھی کبھی کبھار

اپنے لکھنے کے انداز 'اپنے کلیشے' میں قید ہو جاتا ہے۔ زندگی ہر لمحہ بدلتی ہے اور ہمیں بدلتی دنیا کے ساتھ بدلنے کے لئے تیار رہنا چاہئے' خاص طور پر ایک لکھاری کو۔

اگلے ہفتے جاوید دانش اور میری مشترکہ کتاب 'کالے جسموں کی ریاضت' جس میں ہم نے افریقی ادب کا اردو ترجمہ کیا تھا اور میرے ناولٹ 'ٹوٹا ہوا آدمی' کی رسم اجرا میں باقی مقتدر ہستیوں کے ساتھ جوگندر پال بھی تشریف لائے۔ کئی دوستوں اور بزرگوں نے تقریریں کیں۔ جوگندر پال کی باری آئی تو کہنے لگے 'ہر کتاب ایک بچے کی طرح ہوتی ہے۔ پیدائش کے وقت ان کی شخصیت پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ ہم ان کے بارے میں اپنے ابتدائی تاثرات ہی دے سکتے ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرے گا۔ لوگ ان کتابوں کو پڑھیں گے ان کے بارے میں رائے دیں گے۔ عظیم کتابیں ہمارے ساتھ جوان اور ہمارے ساتھ بوڑھی ہوتی ہیں'۔

جاتے وقت جوگندر پال نے ایک دفعہ پھر مجھے گلے سے لگایا اور کہنے لگے 'سہیل! یہ ملاقات بہت مختصر تھی۔ اگلی دفعہ ہندوستان آنا تو میرے ساتھ پورا دن گزارنا۔ پھر ہم مل کر بہت سی باتیں کریں گے'۔

میں جب ان سے جدا ہوا تو دل میں یہ عہد لے کر کہ میں ان سے ملنے ضرور دوبارہ آؤں گا اور اپنی پیاس بجھاؤں گا اور ان کی محبت کی بارش میں بھیگ جاؤں گا۔

جوگندر پال سے ملاقات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔

جون ۲۰۰۶ء

☆☆☆☆☆☆☆